© rasailojaraid.com

رُودادِ ابتلاء: احمد رائف مصری

ترجمہ جناب خلیل الحامدی

(۴)

اب ذرا قلعے کے جیل خانے کا حال سنیے۔ یہ صلاح الدین ایوبی کے قلعے کا ایک حصّہ ہے۔ اسی قلعہ میں محمد علی پاشا نے ممالیک کی گردنیں اُڑائی تھیں۔ جس حصّہ میں ہم رہ رہے تھے اُسے انگریزوں نے درست کیا تھا۔ یہ جیل خانہ تین سو سے زیادہ نظر بندوں کی گنجائش نہیں رکھتا۔ انٹیلی جنس کے ذریعہ تمام تفتیشی کارروائیوں کے لیے بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہماری تفتیش بھی یہیں ہو رہی تھی۔ تنگ و تاریک اور ہوا سے محروم کوٹھڑیوں کے اندر ہم چار، چار، پانچ پانچ افراد رکھے گئے تھے حالانکہ ان کوٹھڑیوں میں دو سے زیادہ افراد کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ مگر یہ مشہور اصول ہے کہ "حالتِ اضطرار میں احکام تبدیل ہو جاتے ہیں"۔

ان دنوں قلعہ کے جیل خانہ میں چار سو افراد محبوس تھے۔ اور یہ اخوان کے خلاف انٹیلی جنس کی تفتیشی سرگرمیوں کے ابتدائی ایام تھے۔ ایک دوسری تفتیش جنگی جیل میں جاری تھی۔ فیوم کے جیل خانے میں بھی دو سو افراد موجود تھے۔ اور یہ فیوم کے قیدی وہی لوگ تھے جو ۱۹۵۴ء میں پیپلز کورٹ کی طرف سے صادر ہونے والی سزاؤں میں سے دس سال کی پوری مدت گذار چکے تھے اور اب دوبارہ شاملِ تفتیش کیے گئے تھے۔

قلعہ کے جیل خانے میں مَیں نے کئی دن گزارے۔ مگر اس کے باوجود وہاں کے کھانے کے بارے میں میری یادداشت بالکل معمولی ہے۔ شاید وہاں کسی انسان کو سرے سے کھانا دیا ہی نہیں جاتا تھا۔ درحقیقت ہم جس ابتلاء سے وہاں دوچار تھے اُس کے سامنے بھوک کے احساس یا کھانے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشتہار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ شاید میں جتنی مدت قلعہ میں رہا ہوں میں نے کھانا چکھ کر نہیں دیکھا ہاں اتنا یاد ہے کہ ایک شام جب میں عذاب شدید کی بھٹی میں سُلگ رہا تھا تو ایک سپاہی نے مجھے چائے کی نصف چھوٹی پیالی پیش کی تھی۔ اور وہ چائے بھی بہت ردّی اور بدذائقہ تھی۔ یہ بھی یاد ہے کہ مسکین زکریا المشتولی جب دم توڑ رہا تھا تو میں نے اُس کے منہ میں ٹھنڈا سا پنیر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ یہ پنیر مجھے کہاں سے ملا تھا۔ بعد میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ قلعہ کے جیل خانہ میں ایک ٹھیکیدار نظربندوں کو کھانا سپلائی کرتا ہے۔ اور یہ ٹھیکیدار ہر نظربند سے کھانے کے عوض کچھ نہ کچھ پیسے وصول کر لیتا ہے۔ جن حالات میں ہم لوگ رہ رہے تھے کمائی کرنے والے کے لیے اُن سے بہتر اور کون سے حالات ہوسکتے ہیں۔ ٹھیکیدار جانتا تھا کہ اُس کے اِس معمولی سے فعل پر کون گرفت کرسکتا ہے۔ وہ کھانا جو سپلائی کر رہا تھا!!

جیل کی کوٹھڑیاں ایک طویل سُرنگ کے اندر تھیں جو دونوں طرف سے کھلی ہوئی تھی۔ پتھر کی سیڑھیوں کے ذریعہ اُن کے اندر اُترا جاسکتا تھا۔ جب کسی شخص کو تفتیش کے لیے پکارا جاتا تو ایک عمر رسیدہ محافظ کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیتا۔ بلائے جانے والے کے لیے لازم تھا کہ وہ دوڑ کر کمرۂ تفتیش میں حاضر ہو۔ اور اگر وہ اپنے آپ پر رحم چاہتا ہے اور کچھ نہ کچھ تعذیب سے محفوظ رہنا چاہتا ہے تو وہ تفتیش کرنے والے کے سامنے بالکل برہنہ کھڑا ہو اور اُسے خود ہی دوڑنے کی حالت ہی میں تن کے کپڑے اُتار پھینکنے چاہییں، تاکہ کم از کم "افتتاحی ٹکٹکی" پر لٹکنے سے بچ جائے۔ زیر تفتیش افراد دو دو روز بالکل عُریاں کمرۂ تفتیش میں رکھے جاتے۔ اور جب وہ واپس کوٹھڑی میں آتے تو کپڑوں کی تلاش کا کوئی موقع نہ دیا جاتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ اچانک کپڑے مل جاتے مگر اس حالت میں کہ بُری طرح خون سے آلودہ ہیں اور ان کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں۔ اور یوں بھی ہوتا کہ کپڑے بالکل ہاتھ نہ آتے، اور وہ اُسی عُریانی کی حالت میں کوٹھڑی میں داخل ہو جاتے۔

جتنے افراد بھی قلعہ کے جیل خانہ میں موجود تھے سب گہرے اور خطرناک زخموں سے چُور رہتے۔ وہاں نہ کسی ڈاکٹر کی نگرانی تھی اور نہ ابتدائی طبی امداد کا انتظام۔!! البتہ مورس نامی ایک بھاری بھرکم تن و توش کا انسان موجود تھا۔ اُسے ڈاکٹر کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ مگر اُس نے بھی مجروحین کی کبھی مرہم پٹی نہیں کی۔ بلکہ ستم یہ ہے کہ ہم نے یہ سُنا کہ بعض مجروحین کو موت کے گھاٹ اتارنے میں یہ شخص بھی شامل تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قلعہ کے ایام کی جو چیزیں مجھے یاد ہیں اُن میں سے ایک خوبرو اور ظریف نوجوان ہے۔ جس بیرک میں تفتیشی کارروائی ہو رہی تھی وہاں آکر وہ کھڑا ہو جاتا تھا اور بڑی حیا آمیز نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا تھا۔ میں اس کی اصلیت کو نہ سمجھ سکا۔ بلکہ پہلی نظر میں میں نے یہ سمجھا کہ یہ بھی کوئی نظربند ہے۔ جن لوگوں کی تفتیش ہو رہی ہوتی تھی وہ انہیں بڑی درد بھری نظروں سے دیکھتا رہتا۔ بعد میں میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی چھوٹا افسر ہے اور ابھی زیرِ تربیت ہے۔ زیادہ وقت نہ گزرا کہ مجھے اُس کے سپرد کر دیا گیا تاکہ مجھ پر تفتیش کا طریقہ سیکھنے کی مشق کرے۔

ایک چھوٹی سی میز پر مجھ سے متعلق کاغذات (جو میری رہائش گاہ سے اُٹھا لیے گئے تھے) پڑے تھے۔ ان میں کچھ ذاتی خطوط تھے جن کا مضمون اور بھیجنے والے کا نام اب مجھے یاد نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ اور عیسائیت کے موضوع پر میرے چند مقالات اور نوٹس تھے۔ ایک ۱۹۶۵ء کی چھوٹی سی ڈائری تھی۔ وہ خوبرو اور ظریف نوجوان یہ کاغذات اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ اور پھر میرے قریب آکر مجھ سے پوچھنے لگا: کیا تمہارے گھر میں فون ہے؟ میں نے جواب دیا نہیں۔ یہ جواب سنتے ہی اس خوبرو اور ظریف نوجوان نے ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا۔ قریب تھا کہ اس سے میری آنکھ پھوٹ جاتی۔ کچھ اور میرے نزدیک ہوا، اور شرربار آواز کے ساتھ وہ مجھے کہنے لگا: "اے کتے کے بچے! کیا جھوٹے بیانات سے تفتیش کا آغاز ہوگا"؟ میرا دماغ جواب دے گیا۔ میرے گھر میں فون کہاں ہے۔ میں نے اُسے حیرت اور افسوس کے جذبات میں ڈوب کر کہا کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے گھر میں فون نہیں ہے۔ پھر کیا تھا۔ اُس خوبرو اور ظریف نوجوان کی طرف سے مجھ پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ یہ وہی نوجوان تھا جو چند لمحات پہلے ہم نکبت زدہ انسانوں کی طرف رحم طلب اور درد آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اُسے بار بار یقین دلاتا رہا کہ میرے گھر پر فون نہیں ہے۔ اور اگر وہ میرے جواب میں شک کر رہا ہے تو جیل خانے کے فون کے ذریعے ٹیلیفون کے محکمہ سے دریافت کر لے۔ اور اگر میرے گھر پر فون ہے تو مجھے اس کا انکار کرنے سے کیا دلچسپی ہے جبکہ ٹیلیفون کا لگانا ابھی تک حکومت کی طرف سے ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔ مگر میری یہ سب گذارشات بے اثر رہیں۔ یہ افسر بڑا اکم فہم نکلا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ یہ میری جان لے لے گا۔ آخر کار میں نے اس بحث و مباحثہ کا جب کوئی حاصل نہ دیکھا تو میں نے تسلیم کر لیا کہ میرے گھر پہ فون ہے۔ اس کے بعد فوراً اُس خوبرو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ظریف نوجوان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی - کامیاب تفتیش کی مسکراہٹ! - میں نے خیال کیا کہ یہ بحرانی مرحلہ بعافیت رفت گذشت ہو گیا - مگر اچانک اُس نے ٹیلیفون کا نمبر پوچھ لیا اور میں شش و پنج میں پڑ گیا - میں اُسے کوئی بھی نمبر بتانے کے لیے تیار ہوا تھا کہ میں نے دیکھ لیا کہ میز پہ رکھی ہوئی میری چھوٹی سی ڈائری کو پڑھ رہا ہے - میں رُک گیا - مجھے یاد آیا کہ آغاز سال میں جب میں نے یہ ڈائری خریدی تھی تو میں نے اس کے پہلے صفحہ پر لکھے ہوئے تمام خانے پُر کر دیے تھے - نام، پتہ، ٹیلیفون کا نمبر - یہ میرے ایک دوست کا ٹیلیفون نمبر تھا - اور اُسی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اُس کا ٹیلیفون نمبر اپنی ڈائری میں درج کر لوں - میں نے اس افسر کے سامنے وہ نمبر فوراً دہرا دیا - آہ! اُس خوبرو اور ظریف نوجوان اور اُس کے معاونین کی طرف سے زدوکوب کی بارش شروع کی - میرے سر پہ گالیوں اور لعنتوں کی بوچھاڑ یوں ہو رہی تھی جیسے دہکتے ہوئے کوئلے مجھ پر پھینکے جا رہے ہوں - یہ خوبرو اور ظریف نوجوان افسر زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے مجھے کہنے لگا: کتّے کے بچے، انکار کا کیا حاصل - ہم تمہاری ایک ایک بات جانتے ہیں -

ایک اور فوجی افسر عبدالمنعم الصیرفی نے مجھے اس خوبرو اور ظریف نوجوان سے آکر چھڑایا - مگر یہ خوبرو اور ظریف نوجوان مجھے اُس روز اس قدر مار چکا تھا کہ موت نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال لی تھیں - یہ نوجوان یہ فرض کر بیٹھا تھا کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اخوان المسلمون کی خفیہ تنظیم کی قیادت کر رہے ہیں - اس مفروضہ کی وجہ سے اب یہ ناگزیر سمجھا جا رہا تھا کہ میں تنظیم کی قیادت کے بارے میں مفصل بیانات پیش کروں - گو یہ بات بالکل محال اور غلط تھی مگر میں نے انکار کا بھی کوئی حاصل نہ دیکھا - عقلمند انسان کے لیے وہاں یہی مناسب بلکہ لازم تھا کہ وہ سوال سنتے ہی جواب دینے لگے - کوئی سا جواب - تردّد اور تامّل ہرگز نہ کرے - فرفر بولتا چلا جائے - جن باتوں کا اُس نے ارتکاب نہیں کیا ہے انہیں بلا جھجک تسلیم کرتا جائے - اُسے وسیع الخیال ہونا چاہیے - جو کہانی گھڑے اُس کا تانا بانا اور گرہیں اچھی ہونی چاہییں - تفتیش کنندہ افسر کو اُس کی کہانی میں سے دروغ و دجل کی بُو تک نہیں آنی چاہیے - یہ سب کچھ اُسے کرنا ہو گا ورنہ اُس کے لیے عذاب مہین ہے -

عبدالمنعم الصیرفی مجھے جیل کے صحن میں لے گیا اور ہم ایک کونے میں جا بیٹھے - وہ میرے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوستی اور ہمدردی کا اظہار کرنے لگا۔ اس سے میرے دل میں کچھ اطمینان وسکون کی لہر اٹھی۔ اُس نے بڑی سادگی کے ساتھ مجھ سے کوئی بیس مرتبہ پوچھا کہ اخوان المسلمون کی خفیہ تنظیم اور اُن کی پانچ رُکنی رہنما کمیٹی کے بارے میں کیا کچھ تفصیلات ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ گفتگو نے خوش کن انداز اختیار کر لیا ہے، اور میں جو کچھ کہوں گا یہ شخص اُسے درست مان لے گا۔ چنانچہ خود میں نے بھی بڑے سادہ انداز میں اُسے جواب دیا، پانچ رُکنی کمیٹی کے بارے میں مجھے قطعاً کوئی علم نہیں ہے۔ اور میرے خیال میں اس نام اور وصف کی کوئی کمیٹی سرے سے ہے ہی نہیں۔

تمہارا یہ خیال کس بنا پر ہے؟

یہ میرا تاثر ہے۔ میری معلومات بھی یہی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اخوان اور ان کی خفیہ تنظیم سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے؟

ہرگز نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ساتھ شرافت اور خوش ذوقی کا اسلوب بے فائدہ رہے گا۔

یہ کہتے ہی وہ شخص جو بظاہر دھیما اور نرم گو انسان تھا یک بیک خونخوار درندہ بن گیا۔ اس نے زور سے ایک چیخ ماری۔ جسے سنتے ہی ہر طرف سے جلاد جمع ہو گئے۔ انھوں نے میرے کپڑے اُتار دیے جن کے پہننے کی اس افسر نے مجھے اجازت دے دی تھی۔ اور اب مجھے گھونسوں، مکّوں، ٹھوکروں اور گالیوں کے جلو میں تعذیب خانے میں لے چلے۔ اے میرے خدا، اب تو ہی وارث ہے۔

تعذیب خانے کے کیلنڈر میں رات اور دن کی کوئی تفریق نہ تھی۔ تعذیب مسلسل جاری رہتی بے انتہا اور نہ انتہا کی کوئی اُمید۔ ہمیں کچھ ہوش نہ رہتا کہ ہم کیا ہیں اور کہاں ہیں۔ کبھی ہم اپنے آپ کو تعذیب خانے میں پاتے، کبھی کوٹھڑیوں کے اندر، کبھی بیت الخلاء کے اندر۔ بے حس اور فاترالعقل ابتلاء و تشدد کے بادل اُمڈ اُمڈ کر آتے۔ ان کی شدت سے ہم نیم جان ہو جاتے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ شریف شہریوں کو گوشے گوشے سے پکڑ پکڑ کر لایا جا رہا ہے۔ کسی گناہ اور کسی جرم کا اُن سے صدور نہیں ہوا۔ سنگدل افسر اُنھیں درندوں کی طرح چیر پھاڑ رہے ہیں۔ اُن سے ایسا راز دریافت کیا جا رہا ہے جسے وہ نہیں جانتے۔ ہر شخص عذاب کی بھٹی میں جلایا جا رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قلعہ جیل کا خونیں ڈرامہ ایک روز ختم ہو گیا۔ تین سے زیادہ انسانی جانیں اس ڈرامے کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ چار سو کے قریب افراد گہرے اور خطرناک زخموں سے دوچار ہوئے۔ چار چار کی ٹولیوں میں ہمیں کوٹھڑیوں سے نکالا گیا۔ جیل خانے کے صحن میں ہم جمع ہو گئے اور یہ پورا صحن بھر گیا۔ لاٹھیاں، کوڑے اور آلاتِ تعذیب غائب ہو گئے۔ حتیٰ کہ تعذیب کی مہمات سرانجام دینے والوں کے چہرے بھی ہمیں دکھائی نہ دیے۔ حاضرین میں سے کوئی شخص اس نئی کارروائی کا راز نہ سمجھ رہا تھا۔

اُسی کھڑکی سے جس میں سے ہم دُنیا کو الوداع کہہ کر قلعہ کے جیل خانے میں داخل ہوتے تھے ادھیڑ عمر کا ایک آدمی اندر آیا۔ لاغر اور نحیف جسم، چہرے کے خدوخال باریک اور غیر نمایاں۔ منہ میں سگرٹ لیے ہوئے جسے انگلیوں میں لینے کے بجائے ہونٹوں میں تھامے ہوئے تھا۔ اُس کی مصاحبت میں تیس سال کا ایک نوجوان تھا۔ گندمی رنگ اور موٹے موٹے نقوش۔ یہ نوجوان بولا کہ جناب ڈاکٹر صاحب آپ لوگوں کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ لوگ خوفزدہ نہ ہوں، اب تعذیب کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ جس جس شخص کو شدید زخم آچکے ہیں وہ اپنا ہاتھ اُٹھائے۔ اُس کے اعلان پر اکثر لوگوں نے ہاتھ اُٹھا دیے۔ اُن کو جو زخم پہنچ چکے تھے وہ شدید سے بھی بڑھ کر تھے۔

ڈاکٹر قطاروں کے اندر سے گزرتا گیا۔ زخمیوں کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر رنج و ملال اور دردمندی کے اثرات طاری ہو رہے تھے۔ جب کوئی گہرا زخم دیکھتا تو برملا جلادوں پر لعنت بھیجتا۔ اور اپنے ساتھی نوجوان کو حکم دیتا کہ زخمی شخص کا نام فہرست میں لکھ لیا جائے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر تمام نظربندوں کے حوصلے بیدار ہو گئے، اور وہ سب حکومت کو گالی دینے لگے اور ظلم اور ظالموں پر لعنت بھیجنے لگے۔ ڈاکٹر بھی سر ہلا ہلا کر ان کے جذبات کی تائید کرتا، اور انہیں دلاسا دیتا۔ یوں وہ ایک ایک زخمی کے پاس سے گزرا۔

یہ ڈاکٹر بریگیڈیر احمد رُشدی تھا۔ ابوزعبل کے تعذیب خانے کا کمانڈر۔ یہ راز چند گھنٹوں کے اندر ہی ہم پر منکشف ہو گیا۔ ہم ابوزعبل پہنچے ہی تھے کہ اس نے جس جس شخص کا نام فہرست میں درج کیا تھا اُسے خوب مارا۔ قلعہ میں جب لوگ معائنہ کروا رہے تھے اُس وقت ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور میں نے اپنے زخم دکھانے سے گریز کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود کہ میرا نام فہرست میں درج نہیں تھا میں بھی اس ظالمانہ مار سے نہ بچ سکا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم ملٹری پولیس کی بند گاڑیوں میں سوار ہو کر ابوزعبل کی طرف چل دیے۔ ان گاڑیوں کے عقبی دروازے میں عسکری پولیس کے سپاہی سرکاری لباس میں بیٹھے تھے۔ سڑکوں پر ان گاڑیوں کو گزرتے ہوئے دیکھ کر عام لوگ یہی خیال کرتے ہوں گے کہ یہ گاڑیاں فوجی جوانوں کو لیے جا رہی ہیں۔ مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ یہ مظلوم نظربندوں کا قافلہ تھا۔ حالیہ تجربات سے پہلے میں بھی اس طرح کی بکثرت فوجی گاڑیاں ادھر اُدھر گزرتی دیکھتا تھا۔ مگر اب مجھے پتہ چلا کہ وہ گاڑیاں دراصل ہمارے ایسے بھائیوں کو اُٹھائے لیے جا رہی ہوتی تھیں جو راہِ حق میں ہمارے پیشرو بنے۔ ہم اپنی گاڑی میں تیس افراد تھے۔ ہمارے ساتھ بدر الفضیبی بھی تھے۔ انہیں چونکہ بہت ہی خطرناک زخم لگ چکے تھے اس لیے ہم نے اُنہیں ایک کمبل میں ہاتھوں پر اُٹھا رکھا تھا۔ (ابوزعبل پہنچنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی بیچارے نے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی)۔

راستے میں میں گاڑی میں سے باہر جھانک کر باشندگانِ مصر کو دیکھتا۔ وہ اُسی طرح چل پھر رہے تھے جیسے پہلے چلتے پھرتے تھے۔ زندگی کی رفتار میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ کسی کو کوئی غرض نہ تھی کہ کیا کچھ گزر رہی ہے۔ المقشرہ (مَمالیک کے عہد میں تعذیب خانے کو المقشرہ کہا جاتا تھا) میں کیا کھیل کھیلا گیا، اس کے بارے میں غالباً عام لوگ کچھ جانتے بھی نہ تھے۔ سڑکوں پر موٹریں فراٹے بھرتی جا رہی تھیں۔ راہ گزر ہماہمی میں مشغول تھے۔ بس سٹاپ پر لڑکے لڑکیوں سے آنکھ مچولی کر رہے تھے۔ سیلابِ زندگی حسبِ معمول رواں دواں تھا۔

مجھے یاد ہے کہ گاڑی میں جتنے میرے ہمسفر تھے، اُن کے چہرے تبسم ریز تھے۔ اور اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ عذابِ الیم کے چنگل سے نجات پانے کی وجہ سے ان کے دل غیر معمولی مسرّت میں ڈوب رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک نوجوان ایسا تھا جو نفسیاتی طور پر بہت رقیق القلب اور بے حوصلہ تھا۔ اُس نے جو کچھ کیا اُسے بھی تسلیم کرتا رہا اور جو نہ کیا اُسے بھی تسلیم کرتا رہا۔ اس جلد بازی میں ہم اسے کچھ ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے اور سمجھاتے کہ ذرا صبر اور حوصلہ سے کام لو۔ مگر وہ کسی کی نہ سنتا۔ اس نوجوان کا خیال تھا کہ اب مرحلۂ تفتیش ختم ہو گیا ہے اور سب لوگوں کو ان کے "جرائم" کے مطابق مختلف سزائیں مل چکی ہیں، سزاؤں کے احکام صادر ہو چکے ہیں اور ابوزعبل ہماری منتقلی سزاؤں کے نفاذ کا نتیجہ ہے۔ جب ہم ابوزعبل پہنچیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ کس کو کتنی سزا ملی۔ اس نوجوان کو میں بہت سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ سزا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے احکام صادر کرنے کے لیے عدالتی کارروائی اور قانونی تدابیر ناگزیر ہوتی ہیں۔ لیکن اس نے کہا: "اے دوست، مصر میں ان باتوں کی کوئی پروا نہیں کرتا"۔ پھر وہ انتہائی استہزا کے ساتھ زیر لب کہنے لگا: "قانون؟ عدالت؟ ضابطے کی کارروائی؟ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ آپ بھول گئے کہ آپ مصر میں رہتے ہیں ——— مصر ——— عجائبات"؟ بے شک اس کی دلیل میری دلیل کی نسبت زیادہ قرین صواب تھی۔ وہ دوبارہ جذبات میں آیا اور کہنے لگا کہ لیمان طرہ (ابوزعبل کی جیل) پہنچ کر ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم حکومت کے حامی بن جائیں۔ اسی وقت حکمران ہمیں رہا کر دیں گے، خواہ ہم نے اُن کے ساتھ کیسے بڑے بڑے "جرائم" کا ارتکاب ہی کیا ہو"۔

یہ تمام معاملہ بڑا اندوہناک اور جگر پاش تھا۔ الم و حزن کے سایے ہی ہمارے منڈلا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ کس لیے یہ انسانیت سوز سلوک کیا جا رہا ہے؟ اس کی کیا بنیاد ہے؟ کس کی خاطر کیا جا رہا ہے؟ اس طرح کے متعدد سوالات میرے ذہن میں پہلے گردش کرتے، پھر ان کی ایک زوردار گھنگھناہٹ کانوں کو سنائی دیتی اور پھر وہ اُن زخموں پر مزید نمک پاشی کرتے جن کے عذاب میں مَیں مبتلا تھا۔

ہفتے کا دن تھا، عصر کے وقت ہم ابوزعبل کی جیل میں پہنچے۔ تعذیب کا دور ختم ہو جانے پر ہم بڑے خوش و خرم تھے۔ اس وقت تک یہی گمان تھا۔ کیونکہ انٹیلی جنس والوں نے بھی خوب اندازہ کر لیا تھا کہ تعذیب کے ہتھکنڈے کارگر ثابت نہیں ہوئے۔ اب ہم ابوزعبل میں کچھ مدت گزاریں گے یہاں تک کہ زخم مندمل ہو جائیں۔ اس کے بعد ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی راہ لے گا ——— اس طرح کی قیاس آرائیوں کے پھیلنے کی وجہ سے ہمارے اندر تازگی اور مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ یہاں تک کہ جب گاڑیوں سے اُتار کر ہمیں ابوزعبل کے افسروں کے حوالے کیا جا رہا تھا تو ہم قہقہے مار رہے تھے۔

جیل کا ایک افسر جب نظربندوں کو وصول کر رہا تھا تو ایک ایک کر کے انہیں باقاعدہ گنتا تھا۔ اس پر ہمارے لانے والے نگران عسکری نے کہا: "مسٹر اسماعیل فکر کی کوئی بات نہیں انہیں وصول کر لے۔ گنتی میں کوئی کمی رہ گئی تو میں اُسے پورا کر دوں گا"۔ یہ سن کر مسٹر اسماعیل نے تعداد گھٹ جانے کا خیال کیے بغیر نظربند وصول کر لیے ——— یہ چھوٹا سا جملہ ہمیشہ میرے ذہن میں گردش کرتا رہتا ہے۔ سوچتا ہوں یہ شخص کیونکر گھٹ جانے والے آدمیوں کی کمی پوری کرتا ہوگا۔ کہاں سے انہیں لاتا ہوگا۔ بیشک وہ جہاں سے بھی چاہے آدمی لا کر کمی پوری کر سکتا ہے۔ درحقیقت کسی شخص کو یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوش نہ تھا کہ دوسرے پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ برحق پابند سلاسل ہے یا ناحق۔

میں عرض کر آیا ہوں کہ ہم بدر القصیبی کو بازوؤں پر اٹھا کر لائے تھے۔ اُس کی حالت بہت خراب ہوچکی تھی۔ جیل کے دروازے کے پاس ہمیں میجر فوزی نظر آیا۔ جو بعد میں کچھ مدت کے لیے جیل کا کمانڈر بھی مقرر ہو گیا تھا۔ بدر القصیبی کو دیکھ کر میجر فوزی بڑا دلگیر ہوا۔ بیچارے بدر القصیبی کو قلعہ والوں نے مار مار کر گندھے ہوئے آٹے کی مانند کر دیا تھا۔ میجر فوزی نے ہمیں کہا کہ اسے فوراً ایک کوٹھڑی میں لٹا دو۔ اس کے بعد ہم نے کبھی بدر کو نہیں دیکھا۔ بدر تاریخ کے اسٹیج سے ہٹ گیا۔ یا تاریخ کا ایک اہم جزو بن گیا —— کوئی شخص نہیں جانتا کہ بدر کی قبر کہاں ہے!

ابوزعبل کی جیل تین منزلہ عمارت میں ہے۔ ہر منزل میں بارہ حجرے ہیں۔ ہر حجرے کو "بیرک" کا نام دیا جاتا ہے۔ عمارت کا صدر دروازہ لوہے کی سلاخوں سے بنا ہوا ہے۔ چار دیواری پر بھی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ یوں اس کا صحن مضبوط و مستحکم قفس کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عمارت تو ابوزعبل کے علاقے میں پہلے سے موجود تھی۔ لیکن اسے نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ نئی عمارت سابقہ عمارت کے کھنڈروں پر بنی ہوئی ہے۔ اس عمارت سے دو سو میٹر کے فاصلے پر ریڈیو اسٹیشن ہے جب ۱۹۵۶ء کی جنگ میں ریڈیو اسٹیشن پر گولہ باری ہوئی تو اس عمارت کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ اس کی ابھی ابھی تجدید و ترمیم کی گئی ہے۔ ٹھیکیدار کی طرف سے محکمۂ جیل خانہ جات کو یہ عمارت ابھی چند روز بعد سپرد کی جانے والی تھی۔ مگر جیسا کہ ہم نے سُنا انٹیلی جنس کے محکمہ نے ٹھیکیدار سے مطالبہ کیا کہ وہ اسے جلد از جلد مکمل کر دے۔ طے تو یہ تھا کہ یہ عمارت کمیونسٹوں کا استقبال کرنے والی ہے۔ مگر مشیت الٰہی کا فیصلہ کچھ اور نکلا۔

جیل خانے میں ہم غروب شمس سے پہلے پہلے داخل ہو گئے۔ اندر مزدور ابھی جلدی جلدی کام مکمل کر رہے تھے۔ جیل میں داخل ہوتے وقت ہمیں عذاب کے فرشتوں میں سے کسی کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ بلکہ جو لوگ ہمیں ملے وہ وسیع الظرف، نرم خو اور رقیق القلب نظر آئے۔ انہوں نے بڑی لطافت اور نرمی سے ہمارے ساتھ معاملہ کیا۔ ہم میں سے ہر شخص نے تین تین کمبل وصول کر لیے۔ بالکل نئے کمبل جو ابھی استعمال میں نہ آئے تھے۔ ایک کٹورا، ایک چمچہ اور ایک چمکدار المونیم کی پلیٹ۔

فضا بڑی خوشگوار اور حوصلہ افزا تھی۔ خوش بختی اور نیک فرجامی کے احساسات اُبھار رہی تھی۔ ہم میں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر شخص اپنے دل کو بہلا رہا تھا کہ وہ اس صاف ستھری اور بالکل نئی عمارت میں بڑے آرام کے ساتھ خوشگوار اور شریفانہ زندگی گزارے گا۔

ایک بیرک میں زیادہ سے زیادہ تیس آدمیوں کی گنجائش تھی۔ بعد میں اُس میں ایک سو تیس افراد ٹھونسے گئے۔ مجھے بیرک نمبر ۱ میں کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ رکھا گیا۔ میں بڑا خوش تھا کہ میرے تمام دوست اِسی بیرک میں رکھے گئے ہیں۔ ہر ایک نے اپنی اپنی اقامت گاہ سنبھال لی۔ اور ہم بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ لیٹ گئے۔ کھانا آیا۔ یعنی لوہے کے غلیظ برتنوں میں دال بھری ہوئی تھی۔ جسے سلاد کے ساتھ پکایا گیا تھا۔ اور دال میں بے شمار کنکریاں ملی ہوئی تھیں۔ الغرض دال بہت ہی ردی تھی، اور برتن بھی بہت گندے تھے، اور اس پر مستزاد سلاد اور کنکریوں کی بڑی مقدار اس میں شامل تھی۔ مگر بایں ہمہ ہم نے اُسے بڑے اشتہا کے ساتھ کھایا۔ ہم میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جنہوں نے قلعہ کے جیل خانے میں قطعاً کوئی چیز نہ کھائی تھی۔

ہمیں انتہائی گھٹیا صابون بھی دیا گیا۔ یہ صابون جیل کے قیدیوں کی پروڈکشن تھی۔ کئی روز سے ہم نے صابون کی شکل نہ دیکھی تھی، صابون لیتے ہی ہم غسل خانوں کی طرف بھاگے تاکہ اپنے بچے کھچے کپڑوں کو دھو ڈالیں جو طرح طرح کی اشیاء سے آلودہ ہو چکے تھے اور ان میں سب سے نمایاں وہ خون تھا جو قلعہ کی جیل میں کپڑوں سمیت بہایا گیا۔ غسل خانے میں دو پیشاب اور پاخانے کے پائیدان تھے۔ اور ایک حوض تھا جس میں تین ٹوٹیاں لگی ہوئی تھیں اور بیک وقت تین اشخاص پانی لے سکتے تھے۔ دونوں پائیدانوں پر دو شاور بھی لگے ہوئے تھے۔ ہم ان پر ٹوٹ پڑے۔ اور ہم میں سے ہر ایک ٹھنڈے پانی کے ساتھ لطف لے کر نہایا اور اُس نے جسم پر گردِ سفر اور گردشِ ایام کے جو اثرات چپکے ہوئے تھے اُتار دیے۔

کچھ ایسے بھی درماندہ انسان تھے جو زخموں کی کثرت اور شدت کی وجہ سے نہ کپڑے دھو سکے اور نہ نہا سکے۔ مگر وہ لوگ اپنی غلاظت و آلودگی کے باوجود خوش و خرم تھے۔ اس لیے کہ وہ اب قلعہ کی خوفناک اور زہرہ گداز دُنیا سے دُور ہو چکے تھے۔ بیرک کے جس حصّے میں ہم سوتے تھے اُس کا دروازہ سلاخوں والا تھا (ان سلاخوں کے اندر سے صرف کھانا داخل کیا جا سکتا تھا) میں نے پورے حصّے پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس کے اکثر مکین سن رسیدہ بوڑھے ہیں۔ نوجوان صرف چند ایک ہی ہیں جو یحییٰ حسین کے دوست ہیں۔ ان میں سے ایک خود میں ہوں۔

یہ دلچسپ پہلو سامنے آیا کہ اس بیرک کے جملہ باسی مصر کی تقریباً تمام موجودہ اسلامی تنظیموں کے وابستگان (باقی بر صفحہ ۴۸)

© rasailojaraid.com